www.bhatkallys.com

گیان چند

فراق صاحب سے میری ملاقاتیں

رسالہ ''نیادور'' لکھنؤ کے فراق نمبر بابت مارچ، اپریل، مئی ۸۳ء کے اداریے میں لکھا ہے، ''فراق جیسی بھاری بھرکم اور بقول مجنوں گورکھ پوری، جید اور جامع شخصیتیں روز روز نہیں پیدا ہوا کرتیں۔ اس لیے ہماری کوشش ہے کہ فراق صاحب کی ادبی زندگی کے ساتھ نجی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔''

میری بھی یہی رائے ہے کہ بڑے ادیب، بالخصوص ''تخلیقی ادیب'' کی زندگی کا ہر گوشہ عوام کی ملک ہے۔ اس کے شائقین کو حق ہے کہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ کمزور یا تاریک ہی کیوں نہ ہو، جانیں۔ پوری شخصیت میں انسانی دلچسپی کا زیادہ سامان ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت میں فراق جیسے بڑے شاعر کی زندگی اور شخصیت کے بعض وہ پہلو سامنے لا رہا ہوں جن سے ان کی تصویر زیادہ مکمل اور حقیقی ہو سکے گی۔

میں جولائی ۱۹۴۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلے کے لیے گیا۔ وہاں اپنے ہم وطن قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک صاحب سے ملا۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی محمد عثمان بھی رہتے تھے جو اردو دنیا میں اطہر پرویز کے نام سے مشہور ہوئے۔ الہ آباد آنے سے قبل دوران انٹرمیڈیٹ میں نے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں، فراق گورکھ پوری کا کلام پڑھا تھا۔ میں انہیں مسلمان سمجھتا تھا۔ الہ آباد پہنچنے کے

پہلے دن اطہر پرویز نے مجھے بتایا کہ فراق ہندو ہیں اور شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہیں، تو دونوں باتوں پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں الہ آباد یونیورسٹی میں چھ سال رہا۔ شروع کی تقریباً آدھی مدت جین ہوسٹل میں اور آخری نصف پی سی بنرجی ہوسٹل میں۔ الہ آباد میں فراق اپنی جوانی ہی میں ایک افسانہ، ایک روایت بن چکے تھے۔ ان کی امرد پرستی کے بارے میں کتنے ہی سچے جھوٹے قصے مشہور تھے۔ جن کے سبب نئے نئے طالب علم ان سے بہت گھبراتے تھے۔ یونیورسٹی میں انہیں دور سے دیکھ لیتے تھے، پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس سلسلے میں ایک بڑا معرکے کا مبالغہ آمیز لطیفہ مشہور تھا جس کی وجہ سے نئے طلبہ کی فراق نے نام ہی سے جان نکلتی تھی۔ جب میں بی اے فائنل میں تھا، میں نے سوچا کہ ان کی لت کے غلو میں اس لطیفے میں بڑا تخیل بھرا ہے، معلوم نہیں فراق صاحب تک پہنچا ہے کہ نہیں۔ میں نے ایک چٹھی میں لکھ کر انہیں بھیج دیا۔ نیچے اپنا نام نہ لکھا بلکہ ۴۲ جین ہوسٹل لکھ دیا۔ ہوسٹل میں صاف ۴۱ رہائشی کمرے تھے، ۴۲ نمبر کا کمرہ ایک اسٹور روم تھا جس پر ٹین کی چھت پڑی تھی۔ ہوسٹل کے طلبہ کی ایسوسی ایشن کا ایک عہدے دار لڑکا انہیں کسی تقریب کے لیے مدعو کرنے گیا۔ فراق صاحب نے اس سے پوچھا کہ ۴۲ نمبر کمرے میں کون رہتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ تو اسٹور روم ہے جس میں کوئی نہیں رہتا۔ آئندہ سال پھر ہوسٹل کے دو عہدے دار لڑکے انہیں مدعو کرنے گئے۔ ان میں ایک لڑکا کمسن، خوشنما اور نازک مزاج تھا۔ فراق صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ تم بہت کمزور ہو، تم روزانہ ایک کیلا اور دو بادام کھا کر اوپر سے مکھن یا (مکھن والا) دودھ پیا کرو۔ ہوسٹل میں اس نسخے پر بہت مذاق رہا۔ کچھ عرصے کے بعد میرا ان کے یہاں جانا ہوا تو فراق صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمہارے ہوسٹل کا ایک لڑکا آیا تھا، کمزور تھا، میں نے اسے دودھ اور پھل کھانے کا مشورہ دیا ہے اس طرح تصدیق ہوگئی کہ واقعی فراق صاحب نے یہ نسخہ تجویز کیا تھا۔

یہ بات ہے اس وقت کی جب میں ایم اے اردو کی جماعت میں تھا۔ اس سے پہلے میں انہیں یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی عمارت کے بیچ سے اپنے گھر جاتے دیکھتا تھا۔ ہمیشہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے برہنہ سر ہوتے تھے۔ رنگ صاف نہ تھا لیکن شخصیت متناسب، جامہ زیب اور بااثر تھی۔ مجھے کبھی ان کے گھر جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ ایک دن ایم اے پری وینس کا کلاس نہ ہوا۔ میرے ہم جماعت مجتبیٰ حسین نے (جواب کوئٹہ بلوچستان یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں) پورے گروہ کو مشورہ دیا کہ آؤ فراق صاحب کے گھر چلیں۔ ہم میں سے کچھ طلبہ مجتبیٰ صاحب کی سرکردگی میں فراق کے گھر گئے۔ ان سے

میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ دیر تک بات چیت ہوئی، ساری ہیبت جاتی رہی۔ میں نے پایا کہ وہ ایسے خوں خوار نہیں جن کے ہاں جانے میں جسم یا جان کا دھڑکا ہو۔

اور اس کے بعد میں ان کے یہاں جانے لگا۔ جب میں پی سی بنرجی ہوسٹل میں آ گیا اور ریسرچ کا طالب علم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ متعدد طالب علم فراق صاحب کو دیکھنا، سننا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں جانے کی جسارت نہیں کرتے۔ میں کئی کئی لڑکوں کو لے کر شام کے وقت ان کے یہاں جاتا، ہم سب کی گھنٹے دو گھنٹے ان سے طرح طرح کے موضوعات پر بات چیت ہوتی۔ باتوں کے بیچ میں رک کر وہ مخاطب پر نظریں گڑا کر آنکھوں کو یوں پوری ۳۶۰ ڈگری کی گردش دیتے کہ مخاطب کی جان ہی نکل جاتی۔

''نیا دور'' کے فراق نمبر کے اداریے میں مدیر لکھتے ہیں:

> جنہوں نے فراق صاحب کو دیکھا ہے وہ ان کی روشن اور چمک دار آنکھوں کی گردش کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم نے اپنی تمام عمر میں ایسی بیدار اور روشن آنکھیں نہیں دیکھی ہیں۔ وہ آنکھیں یقیناً ان کے چہرے پر سزاوار تھیں۔ جو ایک دانشور کا، ایک مفکر کا آئینہ تھا۔

میں نے ان آنکھوں کی گردش کو بار بار دیکھا ہے۔ ان میں دانشوری کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ انہیں دیکھ کر بہت ڈر لگتا تھا جیسے کوئی بے رحم ڈریکیولا یا پنڈاری اپنے صید کو زیر کرنے کے بعد شقاوت کے ساتھ گھورے، اس کی کمزوری کا استہزاز کرے۔ بہر حال میں ساتھی لڑکوں کی کھیپ کی کھیپ کو فراق دکھانے لے جاتا تھا۔ ان میں میرے سوا کوئی بھی اردو کا طالب علم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن فراق صاحب خوب اپنے اشعار سناتے تھے، جم کر سناتے تھے اور رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ہماری ٹولی اٹھنا چاہتی تھی لیکن دیر تک اس کا موقع نہ ملتا۔ ایک مرتبہ اسی طرح شعر سناتے رہے، ہم لوگ اٹھنا چاہتے تھے۔ کہنے لگے اب تھوڑی دیر میں میرا کھانا آنے والا ہے تب تک بیٹھیے۔ کھانا بھی آ گیا شعر خوانی بند نہ ہوئی۔ اس زمانے میں ان کا کھانا بالکل اسی انداز کا سبزی والا طعام تھا جیسا کہ ہوسٹلوں میں عام طور پر کھایا جاتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ تھالی میں ایک چھوٹے تازہ پتے پر ہری چٹنی بھی رکھی ہوتی تھی جیسا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے میس (باورچی خانہ) کا عام دستور تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے بعد انہیں بے فکری ہو گئی اور پھر شعر خوانی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ کھانے کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بتاتا چلوں کہ ایک بار فراق صاحب نے بڑی پتے کی بات کہی کہ اچھے کھانے کی خوبی یہ ہے کہ ایک دال اور روٹی ہی کیوں نہ ہو لیکن ایسی بنی ہو جسے

www.bhatkallys.com

کھا کر پوری طرح سیری ہو جائے، جی خوش ہو جائے۔

انہوں نے کہیں لکھا تھا کہ سقراط امرد پرست تھا۔ مذکورہ بالا صحبتوں میں ایک بار میں نے ان سے اس کی وضاحت چاہی کہ آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ سقراط میں یہ کمزوری تھی؟ کہنے لگے کہ یونانی بہت مہذب تھے۔ انہوں نے سقراط پر جو نوجوانوں کی تخریب کا الزام لگایا تھا اس میں یہ اشارہ بھی مضمر تھا کہ وہ نوجوانوں کو جنسی فعل سے خراب کرتا ہے۔ کچھ دیر اسی موضوع پر بات چیت ہوتی رہی۔ بعد میں میں نے عرض کیا کہ میرے ساتھی آپ کا کلام سننے آئے ہیں، کچھ عنایت کیجئے۔ کہنے لگے، ''ظاہر ہے کہ وہ کلام سننے آئے ہوں گے، امرد پرستی پر بحث کرنے کے لیے نہیں''۔ ان کی اس چٹکی پر میں خفیف ہو گیا۔

ایک بار میں نے ان سے دوسرے طلبہ کے سامنے پوچھا کہ مشہور ہے کہ مہاتما گاندھی نے آپ کے لیے spoilt genius کا فقرہ استعمال کیا ہے، یہ کہاں تک سچ ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں، مہاتما گاندھی کو کیا معلوم کہ میں genius ہوں یا spoilt ہوں۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں ایک اور روایت رائج تھی کہ ایم اے انگریزی میں امرناتھ جھا اور فراق ہم جماعت تھے۔ فراق اتنے ہوشیار طالب علم تھے کہ ان کی وجہ سے امرناتھ جھا نے ایک سال ڈراپ کر دیا کیوں کہ انہیں اندیشہ تھا فراق اول آئیں گے، وہ (جھا) نہیں۔ میں نے فراق صاحب سے اس کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے کہا، ''یہ بالکل غلط ہے۔ امرناتھ جھا بہت اچھے طالب علم تھے۔ میں ایم اے انگریزی میں ان کا ہم جماعت تھا ہی نہیں۔ میں نے کانپور میں رہ کر آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا ہے''۔ ملاحظہ ہو کہ یہ دونوں اصحاب الہٰ آباد یونیورسٹی میں موجود تھے اور ان کے بارے میں کیسی غلط خبر تشہیر پا گئی۔ اہل تحقیق ماتم کریں۔

اسی زمانے میں ان کا شعری مجموعہ ''روح کائنات'' شائع ہوا۔ اس کے انتساب میں کسی محبوب یا محبوبہ سے خطاب کیا ہے۔ جو انہیں دلی کے ہوٹل میں ملا اور ان سے پوچھا، ''کیا آپ کو میری آنکھیں اب بھی اتنی ہی حسین لگتی ہیں؟'' میرا خیال تھا کہ کوئی نازنین ہو گی لیکن مجھ سے ایک کلاس پیچھے کے ایک طالب علم کرشن کمار شرما بے تاب نے بتایا کہ یہ محبوب ایک لڑکا کشیپ نامی ہے جو پی سی ایس میں آ گیا ہے اور شاید راشننگ آفیسر کے طور پر لگا ہے۔ لعنت ایسے جوان کو جو تقریباً پینتیس سال کی عمر میں ایک مرد کا محبوب بن کر ناز و عشوہ دکھاتا ہو۔ فراق کی امرد پرستی کے واقعات اپنی طالب علمی کے زمانے میں سنے۔ بہتوں کے بارے میں مجھے مصدقہ طور پر معلوم ہے لیکن انہیں قطع کرنا ہی مناسب ہے۔ ہاں ایک واقعے کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ اس میں یونیورسٹی کے ایک لیکچرر کے ایک طالب علم سے برتاؤ کا نقطہ

اسفل ظاہر ہوتا ہے۔

جین ہوسٹل میں میرے ساتھ ایک لڑکا رام گوپال باجپئی تھا، ایم کام کا طالب علم۔ بعد میں وہ اور میں دونوں ہوسٹل میں شورش کرنے کے سچے الزام میں ہوسٹل سے نکالے گئے۔ میں تین مہینے شہر میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہا۔ بعد میں جین ہوسٹل سے بدر جہا بہتر سر پی سی بنرجی ہوسٹل میں داخلہ پا گیا۔ چند روز بعد باجپئی نے ایم کام فائنل کا امتحان دیا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہیں رہ کر کسی مقابلے کے امتحان کی تیاری میں لگ گیا۔

یہ لڑکا پکا کیمونسٹ تھا۔ چہرے پر دیہاتی کھردرا پن تھا، بدصورت ہی کہا جا سکتا ہے۔ خدا جانے ایک دن کیا شامت آئی کہ فراق کے یہاں پہنچ گیا۔ کہنے لگا کہ میں کامرس کا طالب علم ہوں، کامرس والوں کی انگریزی کمزور ہوتی ہے۔ فراق صاحب نے کہا کہ تم میرے یہاں آجایا کرو، میں تمہیں روزانہ آدھ گھنٹہ انگریزی پڑھا دیا کروں گا اس کے بعد ایک گھنٹہ پیار کی باتیں ہوا کریں گی۔ یہ سننے پر باجپئی گھبرایا، پھر فراق صاحب نے اسے اپنی کتابوں کی الماریاں دکھانی شروع کیں۔ ایک الماری کے ایک خانے کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''ادھر دیکھو، اس میں شیکسپیئر ہے''۔ دوسری الماری کے خانے کی طرف انگلی سے بتایا، ''ادھر دیکھو اس میں ورڈس ورتھ ہے''، اور اس کے بعد جھٹ سے اپنا کمر بند کھول کر پاجامہ نیچے گرا دیا اور کہا، ''اور ادھر دیکھو۔۔۔'' باجپئی نے گھبرا کر کہا، ''میں چلتا ہوں، باہر کامریڈ آشا رام میرا انتظار کر رہے ہیں''۔ کامریڈ آشا رام پالٹیکل سائنس میں ریسرچ اسکالر تھے اور پکے کیمونسٹ لیڈر تھے۔ بعد میں یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئے۔ فراق نے باجپئی سے کہا، ''کامریڈ آشا رام کو بھی یہیں بلا لو''۔ بہر حال باجپئی کسی طرح جان بچا کر گرتا پڑتا بھاگا۔

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں وطن گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو کسی نے باجپئی اور فراق کا معاملہ بیان کیا۔ مجھے باجپئی ملا تو میں نے اس سے تصدیق چاہی۔ اس نے توثیق کی اور فراق کو بہت گالیاں دیں۔ اس واقعے کے دو افسوسناک پہلو ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یونیورسٹی کا ایک استاد اپنے گھر پر آئے ہوئے ایک طالب علم سے کس وضع سے پیش آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فراق کی جمالیاتی حس محض ایک افسانہ ہو گی کہ وہ باجپئی جیسے گنوار نما بدنما لڑکے پر گر پڑی۔

بعد میں یہ باجپئی پنجاب کے گورنمنٹ کالجوں کا پرنسپل مقرر ہوا۔ جس زمانے میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج لدھیانہ کا پرنسپل تھا، مجھ سے جموں میں آ کر ملا۔ بڑا دبنگ پرنسپل تھا۔ کسی وزیر یا سیاسی

www.bhatkallys.com

لیڈر کی پروانہ کرتا تھا، سفارشوں پر دھیان نہ دیتا تھا۔ وہ آئے دن اس کا تبادلہ کرا دیتے تھے۔ مجھ سے کہتا تھا کہ میرے پاس تھوڑا سا سامان ہے جو میں باندھ کر رکھتا ہوں۔ کرو کہاں تک میرا ٹرانسفر کرو گے۔

فراق کی امرد پرستی کے سلسلے میں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ان کے تیرہ چودہ سالہ بیٹے نے خودکشی کر لی تھی۔ قطعیت کے ساتھ اس کی وجہ معلوم نہیں لیکن الہ آباد میں کچھ ایسا سنا تھا کہ فراق صاحب نے بیٹے کے کسی دوست سے مختلط ہونے کی کوشش کی تھی جس کے صدمے اور غیرت سے بیٹے نے جان دینے کی ٹھان لی۔

گمان ہو سکتا ہے کہ فراق کی امرد پرستی ان کی اہلیہ سے ناآسودگی کے سبب تھی۔ لیکن ایسا ہرگز نہ تھا۔ فراق نے کہا، ''میں بچپن سے over-sexed تھا۔ میرا کوئی ہم جماعت حسین ہوتا تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں۔ اس کے عشق میں میری ہڈیاں چٹخنے لگتی تھیں''۔

کرشن کمار شرما، فراق کے ہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ جوش کا ایک خط فراق کے نام اڑا لائے۔ قیامت کا نامہ تھا۔ سارے کا سارا فحش جنس زدہ۔ جوش نے فراق کے بھی کان کاٹ لیے۔ اس فحاشی میں بھی جدتِ تخیل اور لطفِ زباں تھا۔ اس میں جوش نے منجملہ اور باتوں کے امرناتھ جھا وائس چانسلر اور ڈاکٹر حفیظ سید کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کے جو جملے یا فقرے حافظے کے نہاں خانے میں پڑے رہ گئے ہیں وہ زبانی ہی سنائے جا سکتے ہیں، ضبط تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔ معلوم نہیں وہ بیش بہا خط بے تاب کے پاس محفوظ ہے کہ نہیں۔

''نیا دور'' کے حالیہ فراق نمبر میں ایڈیٹر نے ان کی بیوی کشوری دیوی سے انٹرویو لے کر چھاپا ہے۔ اس بھلی خاتون نے فراق کی تعریفیں ہی کیں، کوئی شکوہ نہیں کیا، کہیں تلخی کا ثبوت نہیں دیا۔ ''نیا دور'' کے اسی شمارے میں رمیش چندر دویدی کا طویل مضمون ''فراق اپنے گھر میں'' پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ فراق اپنی بیوی کو تمام عمر گالیاں دیتے اور ستاتے رہے۔ صورت حال اس سے بھی زیادہ افسوس ناک تھی۔ جب میں ایم اے کا طالب علم تھا تو فراق کے ساتھ کا بنگلہ طلبہ کے ہوسٹل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ میرا ایک ساتھی ہری کرشن اگروال اس میں رہتا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ فراق گھر کے باہر کھڑے ہو کر بیوی کو ایسی فحش گالیاں دیتے تھے جن میں صرف اعضائے جنسی اور جنسی فعل کا ذکر ہوتا تھا۔ سارا محلّہ بشمول طلبہ ان کو سنتا تھا۔ گھر میں بیوی کے ساتھ بیٹی بھی رہتی تھی۔ باپ کے منہ سے وہ جب ایسے زریں کلمات سنتی ہوگی تو اس کے دل میں باپ کے لیے کیا عزت ہوگی۔ فراق نے ۱۹۱۴ء میں شادی کی اور ۱۹۵۶ء میں بیوی کو ہمیشہ

کے لیے گھر سے نکال دیا۔ اس نیک بخت نے ۴۲ سال کا طویل عرصہ دوزخ میں کاٹا اور شمع ساں گھٹ کر جلتی رہی۔ جو شخص اپنی بیوی اور بیٹی سے اس طرح کا سلوک کرے، جس کے بیٹے نے اس کی کرتوتوں کے سبب خودکشی کی ہو، جس کے اپنے بھائیوں سے تعلقات قطع ہوں وہ شخص اچھا شاعر ہو تو ہو، اچھا انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس بیوی کے علاوہ فراق کی زندگی میں کوئی عورت آئی ہو یا انہوں نے صنف نازک کی طرف برائے نام بھی التفات کیا ہو۔ صرف پروفیسر سرور کی زبانی ایک واقعہ سنا۔ انہیں یہ احتشام صاحب نے سنایا تھا۔ شاید جون ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر حسین ظہیر نے حیدرآباد میں ایک کانفرنس بلائی تھی۔ جس میں فراق صاحب اور علیم صاحب، ڈاکٹر حسین ظہیر کے یہاں ٹھہرے تھے اور فراق صاحب کسی گپتا صاحب کے یہاں جو اردو کے فدائی تھے اور کانفرنس کے داعیوں میں سے ایک تھے۔ اگلی صبح احتشام صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ فراق صاحب اپنا سامان لیے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رات کو جلسے سے واپس لوٹے تو نشے میں دھت تھے۔ صاحب خانہ کی تیلگو ملازمہ کو پکڑ لیا۔ وہ چلائی تو میزبان آ کر بہت ناراض ہوا، کہا، "چاہیے تو یہ تھا کہ آپ کو ابھی گھر سے نکال دوں لیکن رات بہت گزر گئی ہے۔ صبح نکلنے کے ساتھ آپ اپنا سامان لے کر دفان ہو جائیے"۔ اس ایک واقعے کے علاوہ مجھے ان کے صنف نازک کے کسی معاملے کا علم نہیں۔

میرا ان کا رشتہ خوردی و بزرگی کا تھا۔ ایک بار میں نے دبے لہجے میں پوچھا کہ ظاہراً آپ کی زندگی میں کوئی عورت تو آئی نہیں آپ یہ عشقیہ شاعری کیوں کر کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، "نہیں، میں تو بہت بڑا عاشق مانا جاتا ہوں"۔ اس کے آگے میں نے نہیں پوچھا کہ کس پر عاشق ہیں؟ "روپ" کی رباعیوں کی نازنین ان کے تجربے اور مشاہدے کی نہیں، دور سے دیکھی اور سنی سنائی ہونی چاہیے۔ بہت زمانے کے بعد جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر آ گیا تھا، میں نے "روپ" کی رباعیوں کے سلسلے میں جاں نثار اختر کے مجموعے "گھر آنگن" کی رباعیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ جاں نثار نے ایک ہندوستانی گرہستن کو خوب پیش کیا ہے۔ اس پر فراق ناخوش ہوئے۔ جاں نثار کی رباعیوں کے مصرعوں کو استہزائی ڈھنگ سے پڑھتے اور کہتے، "یہ شاعری ہے؟" ڈاکٹر سید محمد عقیل کہا کرتے ہیں کہ فراق صاحب میں وہ وسعت قلب نہیں کہ اپنے سے چھوٹے شاعروں کی ہمت افزائی کریں۔

میں نے جون ۴۷ء میں اپنا ڈی فل کا مقالہ "اردو کی نثری داستانیں"، الہ آباد یونیورسٹی میں داخل

www.bhatkallys.com

کیا۔ انہیں دنوں یونیورسٹی سے اردو کے ایک لیکچرر کی جگہ مشتہر ہوئی۔ میں نے بھی درخواست دی۔ فراق صاحب سے ملنا ہوا، ضمناً میں نے اپنی درخواست دینے کا تذکرہ کیا۔ یہ بھی بتایا کہ میرے اساتذہ نے مجھے بہت اچھے سرٹیفکیٹ دیے ہیں۔ فراق صاحب نے کہا، ''آپ نے ایک غلطی کی''۔ میں نے گھبرا کر پوچھا، ''کیا؟''۔ کہنے لگے، ''آپ نے مجھ سے سرٹیفکیٹ نہیں لیا۔ کوئی بات نہیں میں ابھی لکھے دیتا ہوں''۔ اس کے بعد انہوں نے سادہ کاغذ پر اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لکھ دیا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ سرٹیفکیٹ کی انگریزی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

> میں ڈاکٹر گیان چند کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں ہمارے یونیورسٹی سے ایم اے اردو کرنے والوں میں بہ مشکل ایک یا دو طالب علموں نے اتنے اونچے درجے کی اہلیت اور علم و فضل کا ثبوت دیا ہے جتنا کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے۔ اگر انہیں شعبہ اردو میں مقرر نہیں کیا گیا تو یونیورسٹی خسارے میں رہے گی۔ اگر انتخاب کرنے والے میرے سوچے سمجھے اور غیر جانب دار فیصلے کو کوئی اہمیت دیتے ہیں تو وہ بقیہ تمام امیدواروں پر ڈاکٹر جین کو ترجیح دیں گے۔ میں نے یہ چند سطور یونیورسٹی کی الفت اور اس کے مفاد کے زیر اثر لکھی ہیں نہ کہ ڈاکٹر جین کی مدد کی خواہش سے۔
>
> رگھو پتی سہائے فراق
>
> یونیورسٹی بلڈنگس ۴ جولائی ۱۹۴۷ء

درخواست میں پہلے ہی دے چکا تھا۔ میں نے فراق صاحب کا سرٹیفکیٹ نہیں داخل کیا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ صدر شعبہ اردو پروفیسر ضامن علی، فراق صاحب کو پسند نہ کرتے تھے۔ فراق کے سرٹیفکیٹ کا الٹا اثر ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بہر حال میں منتخب نہ ہوا اور مسیح الزماں لیے گئے۔ میرے حق میں کتنا اچھا ہوا الہ آباد یونیورسٹی میں پڑ جاتا تو ۷۲۔ ۱۹۷۱ء تک لیکچرر ہی رہنا پڑتا۔ دوسری جگہ گیا تو ۶۵ء میں پروفیسر ہو گیا۔ ضامن صاحب کے زمانے میں شعبہ اردو میں کتنی ہی شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ شہر کے اعلیٰ ادنیٰ سبھی شاعر بلائے جاتے تھے۔ نہیں بلایا جاتا تھا تو یونیورسٹی کے اندر کا اپنے عہد کا مشہور غزل گو شاعر فراق۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں فراق صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ کہنے لگے، ''ان کے (ضامن صاحب) نزدیک شاعری یہی ہے کہ شیروانی پہن کر پان چبا کر بیٹھے گردن ہلایا کریں۔ میرا

www.bhatkallys.com

وہاں کیا کام!''

میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک حمیدیہ کالج بھوپال میں ملازم رہا۔ ۵۶ء سے یہ کالج وکرم یونیورسٹی اجین سے ملحق ہو گیا۔ میں اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز کا صدر تھا۔ میں نے ریسرچ ڈگری کمیٹی میں ایک بار ماہر کی حیثیت سے فراق صاحب کو بلایا۔ یہ تسلیم کہ فراق کو ریسرچ سے کیا علاقہ لیکن غرض اصلی یہ تھی کہ اجین جانے کے لیے بھوپال سے گزرنا ہوگا۔ اس بہانے بھوپال میں چند روز ادبی سرگرمیاں چمکیں گی۔ فراق، نوابزادہ رشید الظفر کی کوٹھی واقع شملہ پہاڑی میں ٹھہرے اور آٹھ دس دن تک رہے۔ دن بھران کے پاس اہل اردو کا مجمع رہتا۔ کالج کے ایک استاد اور شاعر شہاب اشرف (۳۹) کہتے تھے، ''فراق صاحب کے مستقر پر دن بھر فحش گوئی اور پھکو پن کا دور رہتا ہے، کسی قسم کی علمی گفتگو کا سوال ہی نہیں''۔ میں بھی کبھی کبھی وہاں حاضری دیتا۔ فراق صاحب الہ آباد کے کسی شریر طالب علم رائے صاحب کے متعدد لطیفے سنایا کرتے جس میں جنسیت کی پٹ ہوتی، ایسے بچکانہ قسم کے عریاں لطیفے جن میں کسی قسم کی ذہانت نہ ہوتی۔

ہم لوگ بھوپال سے اجین ٹرین سے گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فراق صاحب صرف قمیص اور پاجامہ پہنے آئے ہیں۔ قمیص کا سب سے اوپر کا گلے کا بٹن بھی بند کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ شیروانی کہاں ہے؟ کہنے لگے گرمی تھی میں اسے بھوپال میں شملہ میں چھوڑ آیا۔ کیسا عجیب لگتا تھا کہ یونیورسٹی کی ایک میٹنگ میں محض قمیص پاجامہ پہن کر جا رہے ہیں۔ اگر کرتا اور پاجامہ ہوتا تو بھی کوئی بات ہوتی...... پاجامہ بھی میلا تھا۔ ریل میں انہوں نے راز افشا کیا کہ ساتھ میں ایک نیا پاجامہ بھی ہے۔ میرے اصرار پر پاجامہ بدلنے کو تیار ہوئے لیکن پاجامہ نکال کر دوسرا پاجامہ پہننے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ساتھ میں میرے کالج کے پرنسپل بھی تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے تقاضا کیا کہ فراق صاحب اب پاجامہ پہن بھی ڈالیے۔ خاصی طویل زیریں برہنگی کے بعد نیا پاجامہ پہنا۔ راستے بھر ایسے خالص فحش لطیفے فرماتے رہے کہ میں عرق عرق ہو گیا۔ میرے پرنسپل نے اردو والوں کے مذاق کے بارے میں کیا سوچا ہوگا!

ہاں سفر میں ایک بات کام کی کہی۔ کہنے لگے، ''ہندوستان میں مفکرین اور دانشوروں کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ طالب علم سائنس کی طرف ڈھل رہے ہیں۔ آرٹس میں نہیں آتے۔ ضرورت یہ ہے کہ حکومت ایک خصوصی تعلیمی ادارہ قائم کرے۔ جس میں ہر سال پچاس اعلیٰ صلاحیتوں کے طالب علم لیے

---

(۳۹) شہاب اشرف حمیدیہ کالج میں کامرس کے لیکچرر اور اردو کے شاعر تھے۔ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام چھپ چکا ہے۔ بعد میں مدھیہ پردیش کے ریوا کے کالج میں کامرس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

www.bhatkallys.com

جائیں۔ انہیں پڑھانے کے لیے ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے استاد رکھے جائیں۔ ان اساتذہ کو پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے (واضح ہو کہ یہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے)۔ ان کے پڑھائے جو طلبہ نکلیں گے ان میں کچھ اعلیٰ قسم کے مفکر ہوں گے"۔

اپنے اونچے ادبی مقام کی وجہ سے وہ مناسب لباس سے بے نیازی برت سکتے تھے۔ لکھنؤ میں پہلی غیر مسلم کانفرنس میں آئے۔ ڈائس پر بٹھائے گئے۔ شیروانی پہنے تھے۔ گرمی لگی ہوگی، بیٹھنے کے ساتھ شیروانی نکال دی اور بھری محفل میں شہ نشین سے چلا رہے ہیں، رمیش رمیش۔ آخر رمیش چندر دویدی آئے۔ شیروانی انہیں تھمائی، کہنے لگے، "پہلے زمانے میں حقہ بردار ہوا کرتا تھا۔ میرا شیروانی بردار ہونا چاہیے"۔ ڈائس پر ایک کرسی پر میں بھی بیٹھا تھا۔ میں نے اٹھ کر ان کے پاس جا کر سلام کیا اور شناخت کی سہولت کی غرض سے بتایا کہ میں گیان چند جموں والا ہوں۔ کہنے لگے، "جموں والا! بمبئی میں ناموں میں ہر چیز والا ہوتا ہے سوا ایک والا کے"۔ میں فوراً سمجھ گیا۔ محجوب ہوا، محظوظ ہوا۔ آپ نے بھی ان کے تخیل کی سطح کا ادراک کر لیا ہوگا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر سے ان کے معرکے کے زمانے میں غالباً "ساقی" کراچی میں ان کی ایک مناظرانہ غزل دیکھی تھی، جس کی ردیف تھی۔ کھوپڑی کا، رسالے کو اس ردیف کی غزل نہیں چھاپنی چاہیے تھی۔

لکھنؤ کی کانفرنس میں فراق نے زوردار تقریر کی۔ بہت داد ملی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے پوری ٹیپ کر لی۔ تقریر کیا تھی ہندی کے خلاف شدید تنقید تھی۔ فراق جب ہندی کا مذاق اڑاتے ہیں تو اہل اردو بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کبھی اس پہلو پر غور نہیں کرتے کہ کیا ہندی کی اس تضحیک و تنقیص سے اردو کو کوئی فائدہ ہوتا ہے؟ تقریر اور مباحثے کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ فریق مخالف کو اپنا ہم خیال کر لیا جائے۔ ہندی کو ڈرائنگ روم میں گوبر رکھنے کے مثل قرار دینے سے کیا اہل ہندی اردو کو پسند کرنے لگیں گے، اردو کو بہتر مقام دینا چاہیں گے؟ ان کی تقریر کا نتیجہ فصل ہوتا تھا، وصل نہیں۔ اس طرح ہندی کو گالیاں دینے سے وہ ہندی کا کچھ نہیں بگاڑتے تھے، اردو کے کاز کو نقصان پہنچاتے تھے اور نادان اہل اردو ہیں کہ ان پھبتیوں پر پھول کر بغلیں بجا رہے ہیں۔

۶۸، ۶۷ء کی بات ہوگی کہ گوہاٹی یونیورسٹی میں تاراچرن رستوگی نے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالہ داخل کیا۔ موضوع تھا "اقبال پر مغربی اثرات"۔ یونیورسٹی نے طے کیا کہ باہر کے ممتحنوں میں ایک انگریزی کا استاد ہو دوسرا اردو کا۔ انگریزی داں بھی ایسا ہو جو اردو سے بھی واقفیت رکھتا

www.bhatkallys.com

ہو۔ فراق اور میں ممتحن مقرر کیے گئے۔

دونوں ممتحنوں کی رپورٹ پہنچنے کے بعد رستوگی نے مجھے لکھا کہ فراق صاحب کی رپورٹ میں صرف دو جملے ہیں:

''میں نے مقالہ دیکھ لیا ہے، سو روپے بھیج دیجئے۔''

مجھے رستوگی نے لکھا:

''خدارا ان سے باقاعدہ رپورٹ بھجوایئے''۔ ادھر یونیورسٹی نے اپنا سر پیٹ لیا اور جناب ممتحن کو لکھا کہ ہم آپ سے زیادہ مفصل رپورٹ کی توقع کرتے ہیں۔ میں نے انگریزی میں ایک مختصر رپورٹ ٹائپ کر کے مسیح الزماں کو بھیجی کہ کسی طرح فراق صاحب سے اس پر دستخط کرا کے گوہاٹی بھجوا دیجئے۔ مسیح الزماں گئے۔ فراق صاحب خفا ہوئے، میرے مسودے پر دستخط نہیں کیے۔ اپنی طرف سے کچھ لکھا، دستخط کیے اور رپورٹ بھیج دی۔ کیا اس سے پہلے فراق کبھی پی ایچ ڈی کے کسی مقالے کے ممتحن نہیں ہوئے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ مقالے کی رپورٹ کس طرح لکھی جاتی ہے؟

جموں میں غالب صدی کی تقریبات ہوئیں۔ وہاں کی صدر کنی کمیٹی کا صدر منِ دیوانہ کو بنایا گیا۔ فراق صاحب کو اس سلسلے میں جموں مدعو کیا۔ پان سات دن رہے۔ ایک دن انگریزی میں کہنے لگے، ''غالب ایسا شاعر تھا جس کا ہر شعر عظیم تھا۔ وہ ایک بڑے پتھر کے بعد دوسرے پتھر پر قدم رکھتا ہوا چلتا تھا۔ ہماری چال میں ایک عظیم پتھر کے بعد دوسرا معمولی پتھر آتا ہے اس کے بعد پھر عظیم پتھر''۔ یعنی میرے ہر دو اشعار میں ایک عظیم ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ ایک تاثراتی نقاد کا تاثر محض ہے ورنہ غالب کا ہر شعر کہاں عظیم ہوتا ہے!

جس روز فراق جموں سے گئے اسی دن پروفیسر سرور صاحب جموں آئے۔ فراق بعض معاصرین کے بارے میں دلچسپ تبصرے کرتے تھے۔ سرور صاحب کے آنے کا ذکر سن کر مجھ سے کہا، ''سرور سے بچ کر رہنا۔'' میں نے جواب دیا کہ مجھے تو ان کی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کہنے لگے، ''میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ کے مکان میں نقب لگالے گا لیکن ...'' مجھے یاد نہیں انہوں نے جملہ کس طرح مکمل کیا تھا۔ ''اردو ادب'' میں زیر نظر مضمون کا نقش اول دیکھ کر سرور صاحب نے مجھے ۸۴ء کو ایک خط میں لکھا:

> مجھے اس کا علم نہ تھا، آپ نے بھی کبھی ذکر نہ کیا۔ میرا ان سے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میں ان سے بحث بہت کم کرتا تھا۔ ہاں ان کی باتیں سنتا رہتا

تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے آپ کو مجھ سے بچ کر رہنے کی کیوں ہدایت
کی؟ یہ ہوسکتا ہے کہ مجنوں کے علیگڑھ سے کراچی چلے جانے کی وجہ سے وہ مجھ
سے آزردہ ہو گئے ہوں۔ مجنوں کو جس طرح میں نے کئی دفعہ توسیع دلائی، اس کا
انہیں علم تھا۔ وہ اچانک مجھ سے بغیر کہے سنے کراچی چلے گئے۔ ہوسکتا ہے فراق
اس میں میرا قصور سمجھتے ہوں حالانکہ کہ قصور اگر تھا تو مجنوں کا تھا۔

ایک بار میں نے فراق صاحب سے ان کے متعلق کلیم الدین احمد کی نگارشات کا ذکر کیا۔ کہنے لگے، ''اس شخص کی آنکھیں بجائے آگے کے پیچھے کی طرف لگی ہوئی ہیں''۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مجھے بتایا کہ ایک بار فراق صاحب کے یہاں یہ موضوع زیر بحث تھا کہ اردو کے پروفیسروں میں کون کون رنگیلی طبیعت کا ہے۔ فراق نے سروری صاحب کے لیے کہا، ''حضرت آبنوس کو بھی لڑکیوں کا شوق ہے''۔ یہ لقب ان کے سانولے رنگ کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ مجھ سے تو فراق نے ان کے لیے دونوں ہاتھوں کو گھماتے دباتے صرف یہ کہا تھا، ''وہ موٹر بہت اچھی چلاتے ہیں''۔

گھوم پھر کر میں اکتوبر ۱۹۶۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر آ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد فراق سے ملنے گیا۔ کہاں ۴۲، ۴۴ء والا دیدہ زیب، زندگی بیز نوجوان، کہاں یہ پیر کھوسٹ، غول جیسا چہرہ، کھنڈر جسم، چڑچڑا مزاج۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ دھڑ پر ایک قمیص اور سویٹر پہنے تھے لیکن پاؤں میں پاجامہ نہ تھا۔ یہ نرالا لباس تھا۔ میں نے سوچا کہ چور چوری سے جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہ جائے، جنسی حیثیت سے ناکارہ ہو گئے تو کم از کم سترنمائی ہی کر لی جائے۔ الہ آباد کے ڈھائی سالہ قیام میں میں جب بھی ان سے ملا کبھی ان کے پاؤں میں پاجامہ نہ دیکھا۔ پہلی ملاقات میں الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب کا ذکر آ گیا۔ میں نے کہا کہ وہی پرانا نصاب چلا آ رہا ہے، میں اس کی تشکیل نو کروں گا۔ حیرت ہوئی جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ نصاب میں کچھ ہندو شاعروں کا اضافہ کرو۔

میں خاموش رہا۔ ہندوئیت کی طرف ان کا رجحان دیکھ کر میں نے کہا کہ یہاں میرے تقرر سے پہلے فلاں صاحب نے سلیکشن کمیٹی کی ایک ممبر کو لکھا تھا کہ ایسے شخص کو منتخب نہ کرنا جو اردو تہذیب کا فرد نہ ہو۔ ان کی در پردہ مراد یہ تھی کہ کسی ہندو کو (یعنی مجھے) نہ لینا۔ فراق صاحب کہنے لگے، ''وہ ٹھیک کہتے تھے۔ ہندوؤں میں تہذیب نہیں ہوتی۔ ہندو گنوار ہوتے ہیں''۔ گویا چت بھی ان کی پٹ بھی ان کی۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ بھی ہندو ہیں، مخاطب بھی ہندو۔ وہ حاضرین کے استثنا کے ساتھ (present

www.bhatkallys.com

(exempted company کہنے کے مہذب آداب کے قائل نہیں تھے۔ میں نے آئندہ سال الہ آباد کے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں کر کے اسے باقاعدہ صنف وار بنایا۔ فراق ایم اے کے نصاب میں تھے ہی نہیں۔ میں نے غزل کے پرچے میں ''گل نغمہ'' کی غزلیں شامل کیں۔ اس کے بعد فراق سے ملا تو انہیں بتایا کہ ایم اے کے کورس میں پہلی بار ان کی ''گل نغمہ'' کی غزلیں شامل کر دی ہیں۔ فرمائش کی، ''میری نظمیں بھی کورس میں رکھو''۔ پھر دریافت کیا، ''ہندو شاعروں کا اضافہ کیا......؟'' میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ ہندوئیت کے جذبے کے زیر اثر کہنے لگے:

''ان لوگوں (مسلمانوں) نے ہندو شاعروں کو ختم ہی لر دیا ہے۔ اس شاعر کو دیکھئے جس کا صرف ایک شعر باقی رکھا ہے''۔

ان کا اشارہ مہاراجا رام نرائن موزوں کی طرف تھا جن کا محض یہ شعر تذکروں میں ملتا ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مجھے ڈاکٹر محمد عقیل نے کہا کہ فراق صاحب کا اصرار ہے کہ مزید ہندو شاعروں کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ اب جو پہلے سے ہیں ان کے علاوہ اور کون شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نصاب میں کسی کو اس کے مذہب کی بنا پر شامل یا خارج نہیں کیا جا سکتا۔ موزوں کے بارے میں، فراق کا تبصرہ سن کر ڈاکٹر عقیل ہنسے کہ اگر موزوں کا صرف ایک شعر باقی رہ گیا ہے تو اس میں بے چارے مسلمانوں کا کیا قصور ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ فراق صاحب کی جو قدر ہوئی وہ اسے اپنے مرتبے سے کم سمجھتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ ایسا ان کے ہندو ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ بیسیوں سال پہلے کی بات ہے کہ حمیدیہ کالج بھوپال کے ایک استاد شہاب اشرف فراق صاحب سے الہ آباد میں ملے تو فراق نے ان سے شکوہ کیا، ''آپ لوگوں نے اردو ادب میں ہندو شاعروں کو صرف اتنی جگہ دی ہے، جتنی اخبار میں wanted کے اشتہار کو دی جاتی ہے۔''

یہی شہاب صاحب معرکہ فراق واثر کے دنوں میں فراق سے ملے۔ فراق نے ان سے کہا، ''آپ کسی شاعر کا نام لیں، میں ان کے رنگ میں اثر پر پیروڈی کروں گا۔'' فراق نے مختلف شاعروں کے رنگ میں جو پیروڈیاں کیں، وہ درج ذیل ہیں۔ شروع میں اس شاعر کا تخلص درج ہے جس کا رنگ اڑایا گیا ہے:

www.bhatkallys.com

سودا

جعفر تری بکواس سے آنکھوں میں کٹی رات
ہونے کو سحر آئی ہے ظالم! کہیں مر بھی

انشا

اثر رو رو کے کہتے ہیں فرقوا راہ لگ اپنی
تجھے ٹھٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
پیچھے پڑی اثر کے بلا بن کے شاعری
پیپل تلے کے بھتنے کے شیطان کی قسم

رنگیں

سنا ہے اثر آج غزلیں پڑھیں گے
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

جان صاحب

اے بوا کس کام کی مرزا اثر کی شاعری
نوج سننے جائے کوئی یہ نگوڑی شاعری

غالب

تاثیر کلام میں، اثر کے
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اسمٰعیل میرٹھی

مصرع کو کھڑا کیا، کھڑا ہے
مضموں کو لٹا دیا، پڑا ہے

ایک اور شعر تھا، جس کا ابتدائی جزو شہاب صاحب کو یاد نہیں رہا:

...... حضرت نواب کا عالم
جیسے کسی سوکھے ہوئے تالاب کا عالم

ممکن ہے کچھ اس طرح رہا ہو:

www.bhatkallys.com

کیا کہیے رخ حضرت نواب کا عالم
یا
یہ ہے سخن حضرت نواب کا عالم

میں الہ آباد میں فراق صاحب سے کئی کئی ماہ کے بعد ملتا تھا۔ ان کا حافظہ بیدار تھا۔ شکایت کرتے اور ڈانٹتے ہوئے کہتے، ''آپ اتنے مہینے پہلے آئے تھے اب اتنے عرصے کے بعد آئے ہیں'' یا ''جب سے آپ الہ آباد آئے ہیں ابھی تک مجھ سے صرف دو بار ملے ہیں''۔ سچ یہ تھا کہ فراق صاحب سے ملنے سے کوئی فرحت نہیں ہوتی تھی۔ ان سے کوئی بحث نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ صرف اپنی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ مصاحبوں کی طرح ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیے تو ٹھیک ہے۔ ان سے ذرا بھی اختلاف کیجئے تو وہ بپھر جاتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی کے پروفیسر وجے دیونرائن ساہی ہندی کے مشہور طنز نگار تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ بہت عرصہ پہلے وہ فراق صاحب کے برابر کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک شام رات کے پہلے پہر فراق کے یہاں ایک مجمع تھا۔ کوئی مسلمان صاحب (جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کسی ادبی معاملے میں فراق سے اختلاف کر گئے۔ فراق نے طیش میں پاؤں سے چپل نکال لی۔ حریف نے بھی چپل نکال لی۔ حاضرین نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ ساہی کو اس واقعے کی اطلاع مل گئی۔ اگلے دن صبح انہوں نے فراق سے پوچھا، ''فراق صاحب رات آپ کے گھر بڑا شور تھا، کیا معاملہ تھا؟'' فراق صاحب نے بڑی سادگی و پرکاری سے جواب دیا، ''کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا تھا''۔ شاید ان کا مطلب ہوگا کہ کچھ لوگوں کو چپل کھانے کو بلایا تھا۔

میں نے زیر نظر مضمون میں مندرجہ بالا مشاہدہ قلم بند کیا تھا کہ ''نیا دور'' کے فراق نمبر میں مرزا جعفر حسین کا مضمون ''فرقوا'' نظر سے گزرا۔ واضح ہو کہ فراق کی تخریب ''فرقوا'' خود فراق ہی کی کی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اوپر انشا کی پیروڈی میں لکھا جا چکا ہے۔ میرے مشاہدے کو مرزا جعفر حسین کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے:

> وہ ذرہ برابر بھی اختلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ غلطی پر بھی ہوتے تو اپنی رائے کو سراہے جاتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان کے سبھی دوستوں کو ان سے یہی شکایت تھی۔

اور اس کے آگے مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین کی سوانح ''میری دنیا'' سے فراق کے بارے

www.bhatkallys.com

میں لکھتے ہیں:

انداز گفتگو جارحانہ تھا۔۔۔اختلاف پر برہم ہو جاتے، سخت سست کہنے کو تیار ہو جاتے۔اختلافات میں مصالحت غالباً ان کے نظریہ تنقید میں جائز نہ تھی۔ بحث کرنے والے کو وہ زبان کھولنے کا مشکل سے موقع دیتے۔ زیادہ تر اپنی ہی کہتے، مقابل کی بات برائے نام سننے کی تاب لاتے ("میری دنیا" ص ۲۸۶)

۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخاب میں جنتا پارٹی کی جیت ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد میں فراق صاحب کے یہاں گیا تو ان سے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا، "کیا آپ نے الیکشن میں ووٹ دیا تھا؟" کہنے لگے، "ہاں دیا تھا"، اور پھر چڑ چڑاتے کاٹ کھانے کے انداز میں بولے، "اور یہ بھی بتادوں کہ میں نے اندرا گاندھی کی پارٹی کو ووٹ دیا تھا"۔

وہ اس کے آگے یہ بھی اضافہ کر سکتے تھے کہ تمہارا جو جی چاہے کر لو۔

ایک بار جوش کی "یادوں کی برات" کا ذکر آیا، کہنے لگے، "اس میں جوش نے سب پر تنقید کی ہے۔ میرے خلاف کچھ نہیں لکھا"۔ میں نے عرض کیا، "آپ بھی اپنی یادداشتیں لکھ دیجئے، بڑا بیش بہا سرمایہ ہوگا"۔ کہنے لگے، "میرے ساتھ دقت یہ ہے کہ میں خود لکھ نہیں سکتا۔ کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جو روزانہ میرے پاس آ کر لکھ دیا کرے۔ آپ کسی طالب علم کو پابند کر دیجئے"۔ میں نے شعبے کے ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر اشفاق حسین سے درخواست کی۔ وہ تین بار گئے، فراق صاحب نے اپنی یادداشت تو لکھائی نہیں، کچھ اور ہی لکھاتے رہے۔ اس کے بعد اشفاق حسین ان کے پاس نہیں گئے۔ میرے جموں یا حیدر آباد کے قیام میں ان کے جو دو چار پوسٹ کارڈ میرے پاس آئے وہ سب انگریزی میں لکھے ہوتے تھے۔ وجہ صاف تھی کہ ان کے گھر پر کوئی اردو لکھنے والا نہیں تھا۔ ہندی والے کچھ لڑکے رہتے تھے یا آتے جاتے رہتے تھے، انہیں بول کر انگریزی میں لکھا دیتے ہوں گے اور نیچے اپنے دستخط کر دیتے تھے۔ الہ آباد کے اپنے قیام میں نے فراق صاحب کو بہت تنہا دیکھا۔ ان کے پاس دو ایک لڑکے دکھائی دیتے تھے جو محض ہندی جانتے تھے اردو نہیں۔ فراق سے ملنے شاذ ہی کوئی آتا۔ وہ دن بھر کمرے میں تنہا لیٹے رہتے تھے۔ انہوں نے باہر کے برآمدے میں لوہے کے سکڑنے والے پھاٹک لگا رکھے تھے۔ اندر سے تالے کو بند کر کے گھر میں لیٹے رہتے تھے۔ چابی اندر آڑ میں رکھی رہتی، ملاقاتی کو بتا دیتے تھے کہ ہاتھ ڈال کر چابی اٹھا لے اور اندر لگا ہوا تالہ کھول لے۔ ایک بار مجھے یوں ہی کرنا پڑا تھا۔

www.bhatkallys.com

جب میں طالب علم تھا، ضامن صاحب نے فراق صاحب کو شعبے میں کبھی بار نہیں آنے ؟ دیا۔ بعد میں بھی وہ باقاعدہ نہیں بلائے گئے۔ صدر شعبہ ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ فراق سے شعبے میں ان عوامل پر تقریر کرائی جائے جن سے ان کے فکر وفن متاثر ہوئے ہیں۔ مدعو کرنے کو ایک روز دوپہر میں میں اور عقیل ان کے گھر گئے۔ عقیل نے برآمدے کے پھاٹک سے اندر جھانک کر دیکھا اور بتایا کہ فراق صاحب برآمدے میں پلنگ پر مادرزاد ننگے لیٹے ہیں۔ ضعف بصر کی وجہ سے میں نہ دیکھ سکا تھا۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر ہم دونوں الٹے پاؤں واپس آ گئے۔

کبھی کبھی بالکل برہنہ سونے کی فراق صاحب کی لت پرانی ہے۔ سرور صاحب راوی ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں بدایوں میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں فراق اور وحشی کانپوری بلائے گئے تھے۔ دونوں کے قیام کا انتظام علی مقصود چیئرمین میونسپل بورڈ کے یہاں سول لائنز میں تھا۔ سامنے سرور صاحب کے ایک ماموں زاد بھائی قیوم بخش کی کوٹھی تھی۔ انہوں نے سرور صاحب سے کہا کہ صبح ہوئی تو وحشی صاحب تقریباً دوڑتے ہوئے ان کے یہاں آئے۔ انہوں نے بتایا کہ رات خاصی جا چکی تھی، جب وہ اور فراق مشاعرے سے واپس آئے۔ صبح تڑکے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ برابر کے پلنگ پر فراق ننگ دھڑنگ لیٹے ہوئے ہیں۔ وحشی صاحب کو اس سے سخت وحشت ہوئی اور وہ وہاں سے بھاگے۔ بدایوں کے بقیہ قیام میں وہ قیوم بخش صاحب ہی کے یہاں مقیم رہے۔

رمیش چندر دویدی ''نیا دور'' میں اپنے بے نظیر مضمون ''فراق اپنے گھر میں'' لکھتے ہیں کہ ایک بار فراق نے الہ آباد میں بڑا شاندار مشاعرہ کیا۔ کئی شاعر ان کے گھر پر ٹھہرے۔ دوسری صبح تمام شاعر تو سویرے ہی اٹھ گئے لیکن فراق آنگن میں ننگ دھڑنگ سوتے رہے۔ نذیر بنارسی کو کیا سوجھی کہ انہوں نے سبھی شاعروں کو آنگن میں اکٹھا کر لیا اور کہنے لگے، ''دیکھ لو یہ شاعروں کی قوم کی وراثت ہے۔''

آمد برسر مطلب۔ کئی دن کے بعد میں اور عقیل پھر فراق صاحب کے یہاں گئے۔ اس دن معمول کے لباس میں تھے یعنی پاؤں میں پاجامہ نہیں تھا لیکن دھڑ میں قمیض تھی۔ ہم نے لیکچر کے لیے عرض کیا۔ وہ فوراً مان گئے اور کہا کہ وقت مقررہ سے کچھ پہلے آ جانا تاکہ میں کپڑے پہن سکوں۔ ہم لوگ تقریر کے دن مقررہ وقت سے کچھ پہلے پہنچے۔ ایک لیکچرر نے انہیں پاجامہ پہنانے کی عظیم خدمت سرانجام دی۔ میں نے کہا، ''میں دوسری طرف کو منہ کیے لیتا ہوں آپ اطمینان سے کپڑے پہن لیجئے۔'' کہنے لگے، ''منہ ادھر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

www.bhatkallys.com

بہرحال وہ شعبے میں آئے۔ وائس چانسلر نے جلسے کی صدارت کی اور فراق صاحب نے ان عوامل کی تفصیل بتائی جن سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی عوامل کا ذکر کرنے کے بجائے انہوں نے اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا پسند کیا۔ انہوں نے دنیا بھر کی زبانوں کے عظیم شاہکاروں، تمام بڑے فلسفیوں، یورپ کے بڑے بڑے بت تراشوں، موسیقاروں، سنسکرت ادب اور ہندو دھرم کے کن کن شاہکاروں کے نام لے دیے۔ میں نہیں مان سکتا کہ فراق صاحب کی ان سب تک رسائی تھی۔ خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا فراق صاحب کی کمزوری تھی۔ ڈاکٹر عقیل اس سلسلے میں ایک دو حقائق پیش کرتے ہیں۔ فراق نے اپنے مجموعہ کلام ''گلبانگ'' (الہ آباد ۱۹۶۷ء) کی ابتدا میں اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس میں ص ۲۲ پر لکھتے ہیں کہ پی سی ایس کے بعد وہ آئی سی ایس میں منتخب ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر عقیل کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، وہ آئی سی ایس نہیں ہوئے۔ اسی طرح عقیل صاحب کے بقول فراق صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں کبھی ریڈر نہیں ہوئے، لیکچرر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی ملازمت کے آخری ایام میں لیکچرر اور ریڈر کی اسامیوں کو ملا کر اسسٹنٹ پروفیسر کا نام دے دیا گیا تھا۔ بعد میں پھر دونوں کو الگ کر دیا گیا۔

ایک طوفانی ملاقات

اب میں ایک طوفانی ملاقات کا ذکر کرتا ہوں۔ دراصل یہ پورا مضمون اسی ملاقات کو افشا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ الہ آباد میں ایک شام مجھے باؤلے کتے نے کاٹا کہ میں نے سوچا کہ جس طرح زمانہ طالب علمی میں دیر شام کو فراق کے یہاں جاتا تھا، اسی طرح اب بھی چل کر بات چیت کا لطف لیا جائے۔ میں پہنچا۔ غروب کا وقت تھا۔ وہ کرسی پر بغیر پاجامہ پہنے اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی ساری مال ومتاع (ستر) سامنے کھلی رکھی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ پیچھے سے کوئی چیز آ کر گری ہے۔ ان کے گھر میں جو ہندی داں چمچے رہتے تھے، ان میں سے ایک سعادت مند نے لال انگوچھا (جو پوربیوں میں بہت مقبول ہے) ان کے ستر پر پھینکا تاکہ عیب برہنگی ڈھک جائے۔ اس غیرت مند نے سوچا ہوگا کہ یونیورسٹی کا ایک صدر شعبہ آیا ہے، اس کے سامنے فراق صاحب کا یوں ستر کھول کر بیٹھنا بدتمیزی ہے۔ فراق صاحب تو اس عام تہذیبی شعور سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ اس وقت بیٹھے شراب پی رہے تھے اور تھوڑی دیر میں ایک لڑکا دونے میں چند جلیبیاں لا کر دے گیا۔ فراق کھاتے رہے اور پیتے رہے۔ ضمناً عرض کر

www.bhatkallys.com

دوں کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے طویل متعلمی اور معلمی دور میں فراق صاحب کے یہاں بار ہا گیا، کبھی انہوں نے پانی کو بھی نہ پوچھا، چائے تو بہت قیمتی تواضع ہے۔ جس سماں کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت نشے کا عروج ہوگا۔ جلال کے عالم میں مجھ سے کہا،

''میں نے سنا ہے آپ کلاس میں یہ کہتے ہیں کہ غالب بڑا شاعر نہ تھا۔''

میں نے جواب دیا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ غالب بڑا شاعر نہ تھا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر نہ تھا۔ اس پر فراق صاحب نے میرے بارے میں جو کچھ کہا اس کے اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن ان کا ماحصل یہ تھا کہ آپ کی شہرت ادب کی تاریخ جاننے والے کی ہے۔ لیکن آپ کو ادب کا ذوق (یا تنقید کا شعور) نہیں، پھر پوچھا، ''اگر غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر نہ تھا تو اور کون ہے؟'' اگر میں یہ کہہ دیتا کہ آپ ہیں، تو بات بن جاتی لیکن میری تو شامت آئی ہوئی تھی۔ میں نے جواب دیا، ''اقبال''۔ اسپین میں سانڈ کا مبارز (matador) لڑائی کے بیچ بیچ میں غصیلے سانڈ کو لال رومال دکھاتا ہے اور اس سے وہ اور بپھر کر حملہ کرتا ہے۔ اقبال کے نام پر فراق کی بھی وہی حالت ہوئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اقبال کے خون کے پیاسے ہیں۔ نشہ گھمنڈ رہا تھا۔ سارے حجابات اٹھ گئے تھے، مقعد کے لیے جو عامیانہ لفظ ہے اس کا فراخ دلی سے استعمال کرتے ہوئے کہا:

کوئی صورت نظر نہیں آتی
کوئی امید بر نہیں آتی

ایسا شعر کہنے کے لیے پھٹتی ہے۔ یہ اقبال کے بس کا تھا؟ پھر اسی غزل کا کوئی اور شعر پڑھا اور پھر تاثراتی تنقید کی معراج دکھاتے ہوئے ''پھٹتی ہے'' کا ورد کرنے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھا، ''اقبال میں کون سی خوبی ہے اور اس کی کون سی نظم اچھی ہے؟'' میں نے جواب دیا، ''مسجد قرطبہ عظیم نظم ہے اور اس میں زمان کا فلسفہ خوب پیش کیا ہے''۔ انہوں نے پھر تاثراتی تنقید کا کمال دکھایا۔ ''مسجد قرطبہ'' کے کسی مصرعے کو بغیر تبصرے کے کھچا کھچا کر استہزائی ریختی والے انداز میں پڑھتے اور بزعم خود یہ سمجھ لیتے کہ انہوں نے اس مصرعے کو پوچ اور لچر ثابت کر دیا اور اس کے بعد یہ شاہکار ڈھلے ترشے جملے کہے:

''اقبال کے یہاں کون سا ایسا فلسفہ ہے جو کسی چار آنے کی فلسفے کی کتاب میں نہیں مل جاتا، اقبال وویکانند کے گھر میں جھاڑو بھی نہیں لگا سکتا۔ اسلام، اسلام کرتا ہے۔ اسلام ـــ نابدان کا کیڑا۔ مسلمان! بینگن کا ٹھیلا ڈھکیلنے والے۔''

www.bhatkallys.com

میں نے اس ملاقات کی تفصیل اور مندرجہ بالا جملے ایک لمبے تامل کے بعد لکھے ہیں۔ فراق پرست مجھ پر ان کی کردار کشی کا الزام لگائیں گے۔ میرے بعض ہندو دوست مجھے خاموشی سے خط لکھیں گے کہ تو نے ہندو ہو کر ایک ہندو کو کیوں متعصب اور فرقہ پرست ٹھہرایا۔ لیکن ذوقِ تحقیق نے مجھے حقیقت کا ایسا شیدائی بنا دیا ہے کہ میں دروغ مصلحت آمیز پر راستی فتنہ انگیز کو ترجیح دینے لگا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا ایمان ہے کہ ہر بڑے ادیب کی شخصیت کو پورے کا پورا صحیح صحیح پیش کرنا چاہیے۔ اس کی شخصیت کا کوئی گوشہ چھپانا نہیں چاہیے۔

ابھی اس ملاقات کا بیان پورا نہیں ہوا۔ میں دکھی تھا کہ کہاں آ پھنسا۔ پھر فراق جی نے سوال کیا، ”تم نے میری نظمیں کورس میں رکھیں؟“ میں نے جواب دیا کہ ”گل نغمہ“ کی غزلیں کورس میں لے لی ہیں۔ آئندہ میٹنگ میں نظموں کے بارے میں فیصلہ کر لیں گے۔“ انہوں نے پوچھا، ”کون کون سی نظمیں لیں گے؟“ سچ تو یہ کہ میں نے فراق کی چند نظمیں پڑھی تھیں۔ تمام نظموں کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کون کون سی نظمیں کورس میں رکھی جائیں۔ فراق ایک گھاگ، خرانٹ، تاڑ گئے۔ کہنے لگے، ”آپ نے میری نظمیں پڑھی ہی نہیں ہیں۔ آپ کو کچھ معلوم ہو تو بتائیں“۔ ذرا دیر پہلے ان کا چہیتا رمیش آ گیا تھا۔ فراق کے اس مزاج شناس نے مجھے سہارا دیتے ہوئے فراق صاحب سے کہا، ”آپ کے سامنے کوئی دوسرا کیسے طے کر سکتا ہے؟ آپ ہی بتائیے“۔ فراق صاحب نے کچھ نظموں کا نام لیا، ”ہنڈولہ“، ”دھرتی کی کروٹ“، اور یاد نہیں کون کون سی۔ میں اکھڑنے کی لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے کہا، ”اب اجازت چاہتا ہوں، آداب عرض“۔ انہوں نے جواب دیا، ”آداب عرض“، اور میں اس Impeachment سے نکل کر بھاگا۔ غنیمت یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھ سے یہ باز پرس نہیں کی کہ مزید ہندو شاعروں کو نصاب میں کیوں شامل نہیں کیا؟ میں نے طے کیا کہ اب ان کے یہاں کبھی نہ جاؤں گا۔ حیرت ہے کہ اس مرتبے پر پہنچ کر بھی انہیں اپنا کلام نصاب میں لگوانے کا اتنا ہوکا تھا۔ بعد میں فراق کے کلام کے عروضی تجزیے کے سلسلے میں میں نے ان کی جملہ نظمیں دیکھیں۔ اردو میں نثری نظم پر بے کار بحث چل رہی ہے۔ ”دھرتی کی کروٹ“ جیسی دوسری غیر شاعرانہ نثری نظم اور کون سی ہوگی۔ چند جستہ جستہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

پرمٹ والے لائسنس والے

یون، اٹلی، یوگو سلاویہ

کشمیر اور نیپال اور تبت

www.bhatkallys.com

ساؤتھ کوریا اور ملایا

پڑھنے لکھنے کی امنگ کو

نر ادھیکار چیشٹا مانا

اب فارموسا پر نظریں ہیں

گو یہ جگہ ہے نہایت چھوٹی

بینک ڈائریکٹر بینک مینجر

کمپنیوں کے، شیئر ہولڈر

ایم اے، بی اے، بی ٹی، سی ٹی

مارشل ایڈ ایٹلانٹک پیکٹ

خانے تڑ پڑ بھرتے جاؤ

ماریشس، کینیا، ٹنگانیکا

لنکا، برنکا، سنگاپور

ہٹلر چیانگ کے اڑا دیے سر

تم نے ہٹلر کو شکست دی

کہتے شرم نہیں آتی

سب سے پہلے رانچس ٹاگ پر

کس نے جھنڈا گاڑ دیا ہے

یہ نظم ادب کے بجائے جغرافیے کے کورس میں لگا دی جائے تو بہتر ہے۔ نظم ''ہنڈولہ'' بھان متی کا پٹارہ ہے۔ دراصل بعض چھوٹی نظموں کو چھوڑ کر فراق نظم گوئی میں ناکام رہتے ہیں۔ ان کی نظمیں نثریت اور اطناب بے جا سے بھرپور ہوتی ہیں، ہاں غزلوں اور رباعیوں کی شعریت میں کلام نہیں۔

میرا خیال ہے کہ غالب کے بعد وہ اپنے سوا کسی کو شاعر ہی نہ سمجھتے تھے۔ ایک شعر میں انہوں نے کہا کہ جوش کے سوا ان کا کوئی حریف نہیں۔ معلوم نہیں جوش کو بھی اپنے برابر سمجھتے تھے کہ نہیں۔ حمیدیہ کالج بھوپال کے شہاب اشرف نے مجھے بتایا کہ جگر کے انتقال کے بعد وہ فراق سے ملے تو فراق نے کہا:

''رشید احمد صدیقی کہتا ہے کہ غزل کے چار ستون تھے۔ جگر کے انتقال سے غزل

www.bhatkallys.com

کا آخری ستون بھی گر گیا ہے۔ اور یہ فراق جو سب کا باپ بیٹھا ہے۔"

رشید احمد صدیقی نے حسرت، فانی، اصغر اور جگر کو غزل کے چار ستون قرار دیا تھا۔ فراق کو حذف کر دینا ان کی زیادتی تھی۔ فراق ان چاروں سے بڑے شاعر تھے۔ اقبال کو وہ اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے اور اس کی عظمت کو دیکھ کر حسد کے سارے اسے گالیاں دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال سے کد کی وجہ ہی سے وہ تحت الشعور میں اسلام اور مسلمانوں سے چڑنے لگے تھے۔ عام طور سے اس کا اظہار نہ کرتے تھے لیکن جب شراب کے نشے نے سینسر کو برخواست کر دیا تھا تو میرے سامنے اپنے دل کی بات کہہ گئے۔ ویسے وہ ہندوؤں کو بھی سخت کہنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد ظ انصاری الٰہ آباد آئے۔ میں انہیں اپنی موٹر میں سول لائنز میں کسی سے ملانے لے گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اب مجھے فراق کے یہاں لے چلئے۔ اس وقت تک رات ہو آئی تھی۔ میں نے کہا، "میں اس بدتمیز آدمی کے یہاں نہ جاؤں گا۔ وہ شراب پیئے ننگا بیٹھا رہتا ہے۔"

انہوں نے کہا، "آپ مجھے ان کے پھاٹک پر چھوڑ دیجئے اندر نہ جایئے"۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں انصاری بتاتے تھے کہ فراق نے میرے بارے میں یہ جاننے پر کہ میں ان کے پھاٹک سے واپس چلا گیا ہوں، میرے بارے میں کچھ طنزیہ جملے کہے۔ اور پھر کچھ عرصے کے بعد کالی داس گپتا رضا الٰہ آباد آئے۔ فراق سے ملنے کی شدید تمنا کا اظہار کیا۔ صبح دس بجے کے قریب میں انہیں فراق کے گھر لے گیا۔ اس وقت تک گٹھیا کے سبب وہ بالکل معذور ہو گئے تھے۔ گھٹنے مڑے رہتے تھے۔ بستر پر لیٹے رہتے تھے۔ میں کالی داس گپتا کو لے گیا۔ فراق ہوش میں تھے۔ بدتہذیبی کا کوئی سوال نہ تھا۔ حسب معمول پاؤں برہنہ تھے اوپر سے جزوی طور پر ایک پتلی رضائی یا دلائی اوڑھے ہوئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ برہنہ نہ دکھائی دے جائیں، میں نے رضائی پاؤں پر اوپر تک اوڑھا دی۔ کالی داس صاحب نے خواہش کی کہ ایک فوٹو گرافر لایا جائے اور فراق کے ساتھ ان کا فوٹو لیا جائے۔ میں فوٹو گرافر کی تلاش میں نکل گیا۔ بہت بعد میں کالی داس صاحب نے مجھے بتایا کہ میں جیسے ہی باہر گیا، فراق جی نے ان سے کہا، "یہ گیان چند خود کو بڑا نقاد سمجھتا ہے، اسے آتا جاتا کچھ نہیں"۔ ان کے تبصرے کا دوسرا جملہ تو صحیح ہے، پہلا محض بہتان ہے۔ میں خود کو بڑا نقاد تو کیا، چھوٹا نقاد بھی نہیں سمجھتا۔

میں جا کر سول لائنز سے ایک فوٹو گرافر کو لایا اور حضرت فراق کا ساتھ کالی داس گپتا کا اور میرا فوٹو کھینچا۔ یہ ہماری زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ بعد میں کالی داس صاحب نے بتایا کہ یہ جاننے پر کہ وہ جوش

www.bhatkallys.com

ملسیانی کے شاگرد ہیں، فراق نے جوش کے کلام کی تعریف کی۔ میرا یہ خیال ہے کہ فراق جوش کی شاعری کو کیا پسند کرتے ہوں گے، دنیوی مصلحت کو پیش نظر رکھا انہوں نے کالی داس گپتا کو خوش کرنے کے لیے تعریف کر دی ہوگی۔ کالی داس گپتا نے ان کی تنہائی دیکھ کر پوچھا کہ وہ کس طرح وقت گزارتے ہیں۔ فراق نے ان سے یہی کہا، ''بہت اچھی طرح گزر رہی ہے''۔ رمیش چندر دویدی نے ''نیا دور'' کے نمبر میں لکھا ہے کہ فراق اپنا غم دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کالی داس صاحب سے ان کا یہ کہنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے ورنہ ان کی زندگی قابل رحم طریقے سے کٹ رہی تھی۔ کالی داس گپتا پیشے کے لحاظ سے فائنانسر ہیں یعنی جدید انداز پر روپیہ قرض دیتے ہیں اور سود کماتے ہیں۔ فراق نے ان سے یہ سن کر کہا، ''میرے پاس بھی کچھ روپیہ ہے اسے کہیں لگوا دیجئے''۔

میں مارچ ۷۹ء کے آخر میں حیدر آباد یونیورسٹی آ گیا۔ ایک بار فراق صاحب کا خط آیا کہ ''مجھے اپنے یہاں کی کوئی ممتحنی دیجئے۔ مجھے Text والا پرچہ نہ دیا جائے بلکہ مضمون نگاری والا پرچہ دیا جائے''۔ میں حیران ہوا۔ فراق صاحب تقریباً مفلوج تھے، وہ کیوں کر کاپیاں دیکھ سکتے تھے، کسی اور سے جچواتے۔ بہر حال ہماری یونیورسٹی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں کوئی باہر کا ممتحن نہیں ہوتا جو استاد پڑھاتا ہے، وہی امتحان لیتا ہے۔ میں نے فراق صاحب کو یہ بتا کر معذرت لکھ دی۔

مجھے فراق سے کوئی پرخاش نہیں۔ وہ کبھی میرے حریف نہیں ہوئے۔ ۷۴ء میں انہوں نے مجھے بے نظیر سٹرفکیٹ دیا۔ وہ یقیناً بڑے شاعر ہیں، بالخصوص غزل اور رباعی کے۔ لیکن اگر کوئی ان کی شخصیت کو معصوم، سادہ اور سہج قرار دے، میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کے فن کو چھوڑ کر محض ان کی شخصیت پر ایک جامع کتاب تیار کرانی چاہیے جس میں ان سب سے مضامین لکھائے جائیں جو ان سے اکثر ملے ہوں۔ اس میں مصلحت سے کام نہ لیا جائے اور گفتنی کے ساتھ ناگفتنی کو بھی بے دریغ افشا کیا جائے تا کہ ایک بڑے شاعر کی پوری شخصیت سامنے آ جائے۔